

دین کی تعریف

لغوی تعریف

عربی میں دین کے معنی، اطاعت اور جزا کے ہیں۔ صاحب مقایس اللغة کے مطابق اس لفظ کی اصل انقیادو ذلّ ہے اور دین اطاعت کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب کہتے ہیں: ”دین ، اطاعت اور جزا کے معنی میں ہے۔ شریعت کو اسلئے دین کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی اطاعت کی جانی چاہئے۔“

قرآن کریم میں ”دین“ کا استعمال

قرآن کریم میں دین، مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی جزا اور حساب (۱) کے معنی میں تو کبھی قانون و شریعت (۲) اور کبھی اطاعت اور بندگی (۳) کے معنی میں۔

دین کے اصطلاحی معنی

مغربی دانشمند اس سلسلے میں مختلف نظریات کے حامل ہیں اور انہوں نے دین کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن میں کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) دین الوہیت کے مقابلے میں پیدا ہونے والے ان احساسات ، اعمال اور معنوی حالات کو کہا جاتا ہے جو تنہائی اور خلوت میں کسی فرد کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ (ولیم جیمز)

(۲) دین، عقائد، اعمال، رسوم اور دینی مراکز پر مشتمل اس مجموعے کا نام ہے جس کو مختلف افراد، مختلف معاشروں میں تشکیل دیتے ہیں۔ (پرسنز)

(۳) دین اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ تمام موجودات اس موجود کا مظہر اور عکس ہیں جو ہمارے علم و ادراک سے بالاتر ہے۔ (ہربرٹ اسپانسر) ہر چند بعض دانشمند حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ دین کی تعریف نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے لیکن پھر بھی یہ نظریہ ہمیں اس بات سے نہیں روکتا کہ ہم مباحث علمی کے سائے میں لفظ دین سے متعلق اپنا مقصد اور ہدف مشخص کریں۔ بھر حال دین سے ہماری مراد مندرجہ ذیل ہے: عقائد اور احکامات عملی کا وہ مجموعہ جو اس مجموعے کے لانے والے اور ان عقائد اور احکامات عملی کے پیروؤں کے دعوے کے مطابق خالق کائنات کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ دین حق، صرف وہی دین ہو سکتا ہے جو خالق کائنات کی طرف سے بھیجا گیا ہو۔ اس صورت میں ایسا الہی دین حقیقت سے مطابقت رکھتے ہوئے

یقینی طور پر انسانی سعادت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ مسلمان دانشمندوں کے ایک گروہ نے دین کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے: وہ مجموعہ جسے خداوند عالم نے بشر کی ہدایت اور سعادت کی خاطر بذریعہ وحی پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعہ انسانوں کے حوالے کیا ہے۔

یہ ایک ایسی تعریف ہے جو صرف دین حق پر ہی منطبق ہو سکتی ہے اور جس کا دائرہ گزشتہ تعریف سے محدود تر ہے۔

بہر حال، قابل غور یہ ہے کہ خالق کائنات پر اعتقاد اور یقین، بہت سے افراد کے نزدیک دین کے بنیادی اراکین میں سے ہے۔ لہذا ہر وہ مکتب جو مارکسزم کی مانند مذکورہ نظریہ کا مخالف ہے، دین نہیں کہلا یا جاسکتا ہے۔

دین کی مختلف جہات

مسلم دانشمندوں نے دین اسلام کی مجموعی تعلیمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) عقائد :

یہ حصہ، دین کی ان تعلیمات پر مشتمل ہے جو ہمیں جہان ہستی، خالق ہستی اور مبداء و منتہا ئے ہستی کی صحیح اور حقیقی شناخت سے روشناس کراتا ہے اس سے قطع نظر کہ ایسی ذات پر اعتقاد اور یقین مسلمان ہونے کی شرط ہے یا نہیں۔

لہذا ہر وہ دینی تفسیر جو مخلوقات کے اوصاف کو بیان کرتی ہو اس حصے میں آجاتی ہے یہیں سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ عقائد دین، اصول دین سے عام اور وسیع ہیں۔ اصول دین میں عقائد دین کا فقط وہی حصہ شامل ہوتا ہے جس کا جاننا اور اس پر اعتقاد و یقین رکھنا مسلمان ہونے کی شرط ہوتی ہے مثلاً توحید، نبوت اور قیامت۔ وہ علم جو دینی عقائد کو بطور عام بیان کرتا ہے وہ علم کلام ہے اور اسی وجہ سے اس کو علم عقائد بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) علم اخلاق:

علم اخلاق تعلیمات اسلامی کا وہ حصہ ہے جو اچھی اور بری بشری عادتوں، انسانی نیک صفات اور ان کے حصول نیز ان سے مزین و آراستہ ہونے کو بیان کرتا ہے مثلاً تقویٰ، عدالت، صداقت اور امانت وغیرہ۔ شہید استاد مطہری کے الفاظ میں:

اخلاق یعنی روحانی صفات اور معنوی خصلت و عادات کی رو سے وہ مسائل، احکام و قوانین جن کے ذریعے ایک اچھا انسان بنا جا سکتا ہے۔ علم اخلاق اسلامی تعلیمات کے اس حصے کی تشریح و تفسیر کرتا ہے۔

یہ حصہ فعل و عمل سے متعلق ہے یعنی وہ تعلیمات جنہیں انسان کو سیکھنا چاہئے اور کون سے امور انجام دینا ضروری ہیں (واجبات) ، کن اعمال کو انجام دینا بہتر ہے (مستحبات) اور کون سے امور قطعاً انجام نہیں دینا چاہئے (حرام) ، کون سے امور ایسے ہیں جن کا انجام نہ دینا بہتر ہے (مکروہ) اور ایسے امور اور اعمال کونسے ہیں جن کا انجام دینا یا نہ دینا مساوی ہے (مباحات)۔ دینی تعلیمات کے اس حصہ کی وضاحت، علم فقہ میں کی جاتی ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ دین کی مختلف جہات کے بارے میں مشہور اسلامی علماء کے نظریات پر مبنی ہے۔ مغربی دانشمند ، مذکورہ تینوجہتوں کو قبول کرتے ہوئے کچھ دوسری جہتوں کے بھی قائل ہیں۔ ان جہتوں میں سے ایک جہت دینی داستانیں ہیں۔ ادیان الہی کی مقدس کتابوں میں ایسی کہانیاں اور قصے بیان ہوئے ہیں جن کے مضامین مقدس اور محرک ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اخلاقی اور معنوی تاثیر کے بھی حامل ہیں مثلاً پیغمبروں کے قصے۔ اس طرح کی مختلف مثالیں خود قرآن کریم میں بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ان داستانوں اور قصوں کو بیان کرنے کا ہدف یہ نہیں ہے کہ علم میں اضافے کی خاطر تاریخی واقعات کو بیان کر دیا جائے بلکہ ہدف یہ ہے کہ بشریت کی اصلاح، اس کی تربیت کی جائے اور گذشتہ افراد کے واقعات و حادثات سے عبرت اور پند و نصیحت حاصل کی جائے۔ مغربی دین شناس دانشمندوں کے نظریات کا محور عیسائی اور یہودی مذہب ہے اور چونکہ ان ادیان کی مقدس کتابوں میں جعلی اور خلاف عقل داستانیں موجود ہیں لہذا وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مختلف ادیان میں وارد شدہ داستانیں ، جعلی اور ساختہ شدہ ہوسکتی ہیں کیونکہ ان داستانوں کو بیان کرنے کا اصل ہدف تعلیم و تربیت ہے۔ یہ بات قرآن کریم میں بیان شدہ داستانوں سے متعلق قطعاً قابل قبول نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید، حق محض ہے اور باطل اس میں داخل بھی نہیں ہوسکتا: ”لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ“ (۴) (جس کے قریب سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل آ بھی نہیں سکتا کہ یہ خدائے حکیم و حمید کی نازل کی ہوئی کتاب ہے ۔)

البتہ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کی بعض آیتیں تمثیل و مثال کا پہلو لئے ہوئے ہیں (۵) یعنی حقیقت معقول کو لباس محسوس پہنا کر پیش کیا گیا ہے لیکن داستان کے تمثیل اور جعلی ہونے میں بہت بڑا فرق ہے۔

ضرورت دین

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سا عامل یا عوامل ادیان کے صحیح ہونے کے بارے میں تحقیق و جستجو کو ضروری قرار دیتے ہیں اور کیوں دین حق کو پہچاننا اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ ایک آزاد فکر و نظر کے حامل شخص کی عقل اس سلسلے میں تحقیق و جستجو کو لازم اور ضروری شمار کرتی ہے اور اس کی مخالفت کو کسی بھی صورت میں قبول نہیں کرتی۔ ایک انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقلی حکم کی بنا پر تحقیق کرے کہ نبوت اور رسالت کا دعویٰ کرنے والے واقعی خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے یا نہیں اور اس تحقیق و جستجو کے سفر میں وہاں تک بڑھتا چلا جائے کہ اس کو اطمینان حاصل ہو جائے کہ وہ سب کے سب غلط اور جھوٹے تھے یا پھر اگر برحق تھے تو ان کی تعلیمات کو سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے کیونکہ:

(۱) انسان ذاتاً اپنی سعادت اور کمال کا طالب ہے اور یہ طلب کمال و سعادت اس کی حبّ ذات سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔ یہی حب ذات انسانی کا رگزاروں اور فعالیتوں کی اصلی محرک ہوتی ہے۔

(۲) پیغمبری کا دعویٰ کرنے والا یہی وعویٰ کرتا ہے: ”اگر کوئی میری تعلیمات کو قبول کرے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے تو ابدی سعادت حاصل کرے گا اور اگر قبول نہ کرے تو ہمیشہ کے لئے عذاب و سزا کا حقدار ہو جائے گا۔“

(۳) اس دعوے کی صحت کا احتمال ہے کیونکہ انسان نبوت کے مدعی کے دعوے کے باطل ہونے کا یقین نہیں رکھتا۔

(۴) کیونکہ مُحْتَمَل (انسان کی ابدی سعادت و شقاوت) ایک قوی عامل ہے اور کوئی بھی مسئلہ اس قدر اہم نہیں ہو سکتا ، ہر چند کسی کی نظرمیاس دعوے کی صحت کا احتمال کم ہو لیکن عقل یہی کہتی ہے کہ اس دعوے کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے بارے میں تحقیق و جستجو کی جائے بالخصوص اس وقت جب یہ احتمال بہت زیادہ قوی اور مستحکم ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی نابینا شخص کہیں جاتے ہوئے کسی ایسے شخص سے ملاقات کرے جو اس سے یہ کہے کہ اگر تم دس قدم بھی آگے بڑھے تو ایسے کنویں میں جا کر گرے گا کہ پھر کبھی اس سے باہر نہ نکل سکے اور اگر داہنے طرف دس قدم آگے بڑھے تو ایسے باغ میں داخل ہو جاوے گا کہ ہمیشہ اس باغ میں موجود نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہو گے۔ نابینا شخص اگر دوسرے شخص کے قول کے صحیح ہونے کا احتمال دے تو اس کی عقل اس سے کہے گی کہ اس دوسرے شخص کے قول کے بارے میں تحقیق و جستجو کرے یا کم از کم احتیاطاً اپنا راستہ موڑ دے۔ لہذا ، اگر انسان کو علم ہو جائے کہ گذشتہ طویل تاریخ میں ایسے والا صفات افراد آئے ہیں جنہوں نے یہ دعوا کیا ہے کہ وہ خداوند عالم کی طرف سے اس لئے بھیجے گئے ہیں تاکہ انسانوں کو ابدی سعادت سے ہمکنار کرسکیں اور دوسری طرف اس بات کا بھی مشاہدہ کرے کہ ان عظیم افراد نے اپنے پیغام کو پہونچانے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے نیز ہدایت انسان میں کوئی بھی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے ساتھ ہی ساتھ مختلف النوع مشکلات و مسائل کا سامنا کیا ہے حتیٰ اپنی جان تک دے دی ہے تو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ان عظیم افراد کے دعوے کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے بارے میں تحقیق و جستجو کی جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دفع ضرر یا نقصان ، عقل کے مسلم احکامات میں سے ہے اور یہ حکم، احتمال اور محتمل کے شدید یا ضعیف ہونے کی بنا پر، شدید یا ضعیف ہو جاتا ہے جتنا انسان کے لئے اس نقصان کے پہونچنے کا احتمال زیادہ ہوگا اور جتنا محتمل شدید ہوگا اتنا ہی اس نقصان اور ضرر سے متعلق عقل کا حکم بھی شدید اور سخت ہو جائے گا۔ دین سے متعلق وہ محتمل ضرر کہ جو دین کے قبول نہ کئے جانے کی صورت میں انسان کی طرف پلٹ جاتا ہے ، ابدی شقاوت اور بدبختی کا باعث بنتا ہے اور کیونکہ یہ نقصان (محتمل) بہت عظیم اور خطرناک ہے ، ہر چند دین کے برحق ہونے کا احتمال جتنا بھی کم ہو ، لہذا احتمالی ضرر کے دفع کرنے سے متعلق عقل کا حکم اپنی جگہ پر مسلم اور باقی ہے۔ حب ذات کے علاوہ ایک دوسرا سبب بھی موجود ہے جو انسان کو ہمیشہ اس بات کے لئے اکساتا رہتا ہے کہ وہ دین سے متعلق تحقیق و جستجو کرے اور وہ حقائق سے متعلق شناخت حاصل کرے ۔ انسان فطرتاً حقیقت جو ہے اور جستجو گری کی حس ہمیشہ اس کی جان سے چمٹی رہتی ہے۔ یہی

وہ حس ہے جو آدمی کو اس بات پر اکساتی رہتی ہے کہ وہ مسائل دینی کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کے بارے میں تحقیق و جستجو کرے۔ کیا اس کائنات کا کوئی خالق ہے؟ اگر ہے تو وہ خالق کون ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ خدا سے انسان کا رابطہ کس طرح کا ہے؟ کیا انسان مادی بدن کے علاوہ غیر مادی روح بھی رکھتا ہے؟ کیا اس دنیوی زندگی کے علاوہ بھی دوسری کوئی زندگی ہے اور اس زندگی سے اس زندگی کا کیا رابطہ ہے؟ یہ سوالات اور اس طرح کے سینکڑوں سوالات ایک حقیقت جو، انسان کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے اور اس وقت تک چمٹے رہتے ہیں جب تک اسے ایسے جوابات نہ مل جائیں جو اس کو مطمئن کرسکیں۔ ہر دین کا عقائد پر مبنی حصہ درحقیقت اس طرح کے سوالوں سے متعلق اس دین کے جوابات ہی ہیں۔

بشر کی دین سے توقعات

(مذکورہ عنوان ،دین یا دینداری کے فوائد، دین کی کارگزاریاں یا انسان کو دین کی ضرورت جیسی سرخیوں کے تحت بھی بیان کیا جا سکتا ہے ۔) گذشتہ مباحث میں ادیان کے بارے میں تحقیق و جستجو سے متعلق بحث کی گئی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک آزاد اور وشن فکرانسان عقلی حکم کے تحت دین کے بارے میں تحقیق و جستجو کے لئے کافی مقدار میں دلائل رکھتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود اپنی ذات سے یہ سوال کریں کہ آخر انسان کو دین کی ضرورت ہی کیوں ہوتی ہے اور دین بشریت کو کون کونسے فائدے پہونچاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ، ”بشر کی دین سے توقعات کیا ہیں؟ اس سوال کا اجمالی اور مختصر جواب تو یہی ہے کہ 6دین سے یہ توقع اور امید رکھتا ہے کہ دین اس کو دنیا و آخرت میں ابدی کمال اور سعادت تک رہنمائی کرے گا اور یہ ایک بہت بڑی اور اہم توقع ہے کہ جس کی فقط دین ہی برآوری کرسکتا ہے اور جس کا دین کے علاوہ کوئی مترادف یا متبادل طریقہ بھی نہیں ہے۔ البتہ اس بنیادی اور وسیع ضرورت کے علاوہ دوسری توقعات اور ضرورتیں بھی موجود ہیں۔ مختصراً انسان کی دین سے وابستہ توقعات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) دین قابل اثبات اور استدلال ہو یعنی عقل و منطق اس کی پشت پناہی کرتی ہو۔ دوسرے الفاظ میں دین کے اصول و تعلیمات عقل کے نزدیک باطل اور غیر قابل قبول نہ ہوں۔

(۲) دین انسان کی زندگی کو معنی و مفہوم بخشنے والا ہو یعنی انسان کو ایک حیثیت عطا کرنے اور اس فکر و نظریے کو اس کے ذہن سے خارج کرنے والا کہ زندگی لا یعنی اور بیکار ہے۔

(۳) دین باهدف، شوق و عشق پیدا کرنے والا و انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہو۔

(۴) انسانی اور اجتماعی اہداف کو تقدس بخشنے والی قدرت کا حامل ہو۔

(۵) ذمہ داریوں اور وظائف و تکالیف کا احساس دلانے والا ہو۔

مندرجہ بالا نکات میں سے پہلا اور دوسرا نکتہ بنیادی اور اصلی ہے۔ پہلا اس لئے اہم ہے کیونکہ کسی دین کے اصول عقائد کا منطقی اور عقلی ہونا اس دین کو قابل قبول بنانے میں نہایت موثر ثابت ہوتا ہے اور شک و شبہات اور سوالات و مشکلات کو برطرف کرتا ہے۔ دوسرا اس لئے اہم ہے کیونکہ ہماری دنیوی زندگی ہمیشہ رنج و الم اور مصائب و مشکلات میں بسر ہوتی ہے ان مشکلات و مسائل میں سے بعض غور و فکر اور تدبیر و ترقی علم و سائنس کی بنا پر حل ہوجاتے ہیں اور بعض اصلاً کسی بھی طرح حل ہونے کا نام نہیں لیتے۔ مثال کے طور پر:

الف: انسان حقیقت جو اور جستجو گر ہے اور اس لئے کہ کہیں وہ جاہل یا خاطی نہ رہ جائے ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔

ب: انسان خیر کا طالب ہے اور چاہتا ہے کہ غلطیوں اور خطاؤں سے پاک و منزہ رہے۔ یہ سوچ کر کہ وہ بدکردار اور غلط کاریوں میں گرفتار ہو گیا ہے، ہمیشہ رنجیدہ رہتا ہے۔

ج: انسان زندگی جاوید کا خواہاں ہوتا ہے اور موت اس کی زندگی کے خاتمے کے عنوان سے اس کو ہر اسان کرتی رہتی ہے۔

د: انسان لامتناہی اور لامحدود افکار و نظریات کا حامل اور خواہاں ہوتا ہے لہذا محدودیت اور نقائص اس کی ذہنی پریشانیوں کا باعث بنتے ہیں۔

ہ: انسان یہ مشاہدہ کر کے کہ وہ اپنی پیدائش کے زمانے ہی سے جسمانی یا عقلی طور پر دوسرے افراد کے مقابلے میں پسماندہ ہے، ذہنی کوفت و پریشانی کا شکار رہتا ہے۔ فقط دین ہی وہ ذریعہ ہے جو انسانی زندگی کو باہدف اور معنی و مفہوم عطا کر کے انسان کی پریشانیوں اور رنج و آلام کو آسان اور برداشت کے قابل بنادیتا ہے۔ اگر انسان یہ جان لے کہ اس کائنات کا خلق کرنے والا ایک حکیم اور رحمان و رحیم خالق ہے کہ جو کسی بھی بندے کے ساتھ بخل سے پیش نہیں آتا ہے، سارے انسان اس کے نزدیک مساوی ہیں، اس کے نزدیک تقویٰ سے بڑھ کر تقرب کا اور کوئی دوسرا اہم ذریعہ نہیں ہے نیز وہ عادل ہے اور کسی بھی مخلوق پر ذرہ برابر ظلم و ستم روا نہیں رکھتا تو اچانک ایسے انسان کے تمام مسائل و مشکلات، آسان اور رضائے خالق میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور ایسے شخص کے تمام رنج و غم اس عاشق کے رنج و غم کی طرح شیریں اور لطف آور ہو جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے معشوق کے وصال اور قرب کی خاطر ہنس کھیل کر برداشت کرجاتا ہے۔ یہی وہ درد و غم ہے جس کو عاشقان اور عارفان کسی بھی قیمت پر فروخت کرنے کیلئے راضی نہیں ہوتے

دین کی بشریت سے وابستہ توقعات

ظاہر ہے کہ دین ، عقائد اور احکام کا ایک مجموعہ ہے لہذا اس سے اس بات کی توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ انسان یا غیر انسان سے کسی طرح کی توقع رکھتا ہوگا بلکہ یہاں دین کی بشر سے وابستہ توقعات سے مراد شارع اور دین کو نازل کرنے والے یعنی خداوند عالم کی بشر سے وابستہ توقعات ہیں۔ مختصراً، شارع کی ایک انسان سے یہی توقعات ہو سکتی ہیں کہ وہ دینی عقائد کو قبول کرتے ہوئے ان پریقین محکم اور ایمان کامل لائے، دین کے احکام اور قوانین کو عملی جامہ پہنائے نیز اپنے کردار و گفتار کو دین کے مطابق ڈھالتے ہوئے صفات رزیلہ کو خود سے دور اور صفات حسنہ سے خود کو آراستہ کرے۔ واضح ہے کہ مذکورہ امور درحقیقت انسان ہی کے لئے اور اس کو منفعت بخشنے والے ہیں یعنی جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین انسان سے مذکورہ امور کی انجام آوری چاہتا ہے تو اس سے مراد یہ قطعاً نہیں ہوتی ہے کہ انسان اپنی ذات میں سے کچھ سرمایہ دین کے نام وقف کردے یا اپنی ذات سے کچھ کم کردے اور دین کے اوپر انبار لگادے بلکہ ان امور کی انجام دہی صرف اور صرف انسان کے لئے مفید اور اس کے مفادات سے وابستہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں دین، بشر سے یہ چاہتا ہے کہ بشر خود کو کمال پر پہنچائے اور خدا کی برتر و اعلیٰ نعمتوں سے لطف و اندوز ہو۔ (قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجَرٍ فَهَوَ لَكُمْ) یعنی کہہ دیجئے کہ میں جو اجر مانگ رہا ہوں وہ بھی تمہارے ہی لئے ہے۔ (٦)

دین کی طرف رغبت کے اسباب

دین ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تاریخ، بشریت کی تاریخ کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہے۔ اس واضح اور آشکار حقیقت کے باوجود ایسے افراد بھی گزرے ہیں جو دین کے منکر رہے ہیں۔ خدا پر اعتقاد اور اس کی پرستش، مبدأ ہستی کے عنوان سے ہر زمان و مکان میں تمام بشری معاشروں میں مختلف تہذیب و فرهنگ کے ساتھ ساتھ مختلف شکل و صورت میں موجود رہی ہے اور ہے۔ اس ناقابل انکار حقیقت نے ایسے لوگوں کو جو دین کی حقانیت کے قائل نہیں ہیں اور دینی عقائد کو باطل شمار کرتے ہیں، اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ابتدائے تاریخ بشریت سے اب تک لوگوں کے دین پر اعتقاد اور یقین کی توجیہ کریں اور اپنے اعتبار سے اس کے لئے (باطل) دلائل پیش کریں اور یہ بتائیں کہ کیوں بشر دین کی طرف راغب ہوتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے اشخاص کے نزدیک جو اس کائنات کے خالق یعنی خدا کو نہیں پہچانتے ہیں، انسانیت کے اس عظیم کارواں کا اپنے خالق پر اعتقاد و یقین اور اس کی پرستش نہایت وحشت ناک اور خوفناک ہوتی ہے اور اسی لئے وہ کسی نہ کسی طرح اس کی توجیہ اور تاویل کر کے اپنا دامن جھاڑنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں جو نظریات بیان ہوئے ہیں وہ کبھی کبھی تو اتنے بے بنیاد اور باطل ہوتے ہیں کہ عقل متعجب ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان نظریات میں سے بعض نظریات کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

(۱) نظریہ خوف

فرائڈ (SIGMOND FREUD) نے خدا اور دین پر اعتقاد و یقین کا سرچشمہ خوف کو بتایا ہے البتہ اس سے قبل

بھی یہ نظریہ پایا گیا ہے۔ شاید سب سے پہلے جس شخص نے یہ نظریہ پیش کیا تھا روم کا مشہور شاعر ٹیٹوس لوکر ٹیس (متوفی : ۹۹ء) ہے۔ اس کا قول تھا کہ خوف ہی تھا کہ جس نے خداؤں کو پیدا کیا ہے۔ بہر حال یہ وہ نظریہ ہے کہ جس کی رو سے طبیعی اسباب مثلاً سیلاب، طوفان، زلزلہ، بیماری و موت اس بات کے موجب ہو گئے ہیں کہ انسان ان تمام خوف آور طبیعی اسباب کو مشترکہ طور پر خدا کا نام دے دے۔ فرائڈ کے مطابق خدا، انسان کی خلق کردہ مخلوق ہے نہ کہ اس کا خالق۔ فرائڈ کے بقول درحقیقت بشری ذہن میں دینی عقائد پر اعتقاد و ایمان ان اسباب کے نقصانات اور ضرر سے محفوظ رہنے کی خواہش کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ زمانہ اول کا بشر ان اسباب کے نقصانات اور اثرات کے خوف اور ڈر سے آہستہ آہستہ ایک ایسی صاحب قدرت ہستی کا قائل ہو گیا جو اس کے اعتبار سے ان تمام اسباب پر غالب اور مسلط تھی تاکہ اس طرح اس عظیم اور قادر ہستی کے حضور دعا، مناجات، قربانی، عبادت وغیرہ کر کے اس ہستی کی محبت و لطف کو ابھارے اور نتیجہً خود کو ان خطرات سے محفوظ کر لے۔

(۲) نظریہ جہالت

ویل ڈورانٹ (WILL DURANT) اور برٹرانڈ رسل (BERTRAND RUSSELL) کی مانند بعض افراد اس نظریے کے قائل ہیں کہ شروعاتی زمانے کے انسانوں نے جہالت اور لاعلمی کی بنا پر اپنے اندر خدا اور دین پر اعتقاد پیدا کر لیا تھا۔ یہ جاہل انسان جب چاند گرہن، سورج گرہن، آندھی اور بارش وغیرہ جیسے قدرتی واقعات و حادثات سے روبرو ہوتا تھا اور ان جیسے واقعات کی کوئی طبیعی اور ظاہری علت تلاش نہیں پاتا تھا تو لا محالہ ایک فرضی علت تلاش کر لیتا تھا اور اس علت کا نام ”خدا“ رکھ دیتا تھا اور پھر مذکورہ تمام حادثات کو اس خدا سے منسوب کر دیتا تھا۔ خدا انسان پر اپنا عذاب نازل نہ کرے اور اسے زمینی اور آسمانی بلاؤں میں گرفتار نہ کرے لہذا وہ خدا کے سامنے خضوع و خشوع کے ساتھ سربسجود ہو جاتا تھا۔

مذکورہ دو نظریوں پر تبصرہ

(۱) یہ دونوں نظریے فرضی اور احتمالی ہیں اور ان کے تاریخی اثبات و ثبوت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

(۲) اگر اس فرض کو تسلیم کر بھی لیا جائے کہ تمام یا بعض انسان خوف یا جہالت کی بنا پر خدا کو باور کر لیا کرتے تھے اور اس کی پرستش کرتے تھے تب بھی منطقی لحاظ سے یہ نیتحہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ ”خدا موجود نہیں ہے اور تمام ادیان باطل اور لغو ہیں“ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ تمام نظریات صحیح ہیں تو صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ دین اور خدا پر بشر کا اعتقاد و یقین غلط روش اور طریقے پر مبنی ہے اور یہ غیر از نفی وجود خدا اور نفی حقانیت دین ہے۔ مثلاً، تاریخ بشریت میں ایسے نہ جانے کتنے اختراعات و اکتشافات پائے جاتے ہیں جو شہرت طلبی، ثروت طلبی یا عزت و مقام طلبی کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں جو یقیناً غیر اخلاقی اور غیر صحیح افکار و اقدام تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اخلاقی افکار کی بنیاد پر وجود

میانے والے علمی اختراعات و اکتشافات بھی غلط یا باطل قرار پا جائیں گے۔ مختصراً یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان نظریات میں کسی فعل کو انجام دینے کا ”جذبہ“ اور اس فعل کا ”حصول“ مخلوط ہوگئے ہیں یعنی ایک شے کے باطل ہونے کو دوسری کا باطل ہونا فرض کر لیا گیا ہے۔

(۳) ایسے بہت سے حقائق ہیں جو ان دونوں مذکورہ نظریات کے برخلاف گفتگو کرتے نظر آتے ہیں مثلاً:

اولاً:

تاریخ گواہ ہے کہ دین کو انسان تک پہنچانے والے اور بشر کو خدا کی طرف دعوت دینے والے پیغمبر ہمیشہ دلیر اور شجاع ترین افراد ہوا کرتے تھے اور سخت ترین حالات اور مشکلات سے بھی ہنس کھیل کر گزر جاتے تھے۔

ثانیاً:

نہ جانے کتنے ایسے ڈر پوک اور بزدل افراد گزرے ہیں جو خدا پر ذرہ برابر اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور آج بھی ایسے افراد دیکھے جا سکتے ہیں۔

ثالثاً:

اگر خدا پر یقین و اعتقاد کی بنیاد طبیعی حادثات و واقعات ہیں تب تو موجودہ دور میں خدا پر ایمان باطل، ختم یا کم از کم قلیل ہو جانا چاہئے کیونکہ آج انسان بہت سے طبیعی حادثات و واقعات پر غلبہ حاصل کرچکا ہے۔ اس کے بر خلاف آج ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ آج بھی خدا پر ایمان اور اس کی پرستش دنیا بھر میں وسیع پیمانے پر رائج اور موجود ہے۔

نظریہ جہالت کی تردید کرنے والے موارد بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا تذکرہ کافی ہے کہ دنیا میں ایسے بہت سے دانشمند پائے گئے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے خدا پر ایمان و اعتقاد رکھتے تھے مثلاً نیوٹن (ISAAQ NEOTON)، گیلیلیو (GALILEO) آئن انسٹائن اور نہ جانے ایسے ہزاروں کتنے افراد اور آج بھی ایسے خدا پر ایمان رکھنے والے افراد کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) ہمارے اعتبار سے دین کی طرف انسان کی رغبت کی وجوہات دو ہیں:

پہلی یہ کہ تاریخ کے شروعاتی دور ہی سے بشر یہ سمجھتا آیا ہے کہ ہر شے ایک علت چاہتی ہے اور ایسی شے جو ممکن الوجود ہو، اس کے لئے محال ہے خود بخود پیدا ہوسکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وجود خدا اور اس کی پرستش پر ایک طرح کا پو شیدہ یقین و ایمان تمام انسانوں کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں رہتا ہے یعنی جس طرح حقیقت طلبی اور حسن پرستی فطری طور پر ہمیشہ سے تمام انسانوں میں پائی جاتی رہی ہے اسی طرح سے خدا شناسی اور خدا پرستی بھی ہمیشہ سے بشریت کا خاصہ رہی ہے اور یہی وہ فطرت الہی ہے جو ان کو خدا پر ایمان و یقین کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ دین کی طرف انسان کی رغبت سے متعلق اور بھی بہت سے نظریات بیان ہوئے ہیں لیکن ان سب کی وضاحت اور نقد ظاہر ہے ان مباحث کو طولانی

کردے گی جو یہاں مناسب نہیں ہے۔ مذکورہ نظریات کی وضاحت اور نقد سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان نظریات کو پیش کرنے والے افراد شدید تعصبات کی بنیاد پر دین کی مخالفت اور نفی کر بیٹھے ہیں نیز یہ کہ محبت یا بغض کی زیادتی بھی اکثر عقل کو اندھا کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں، ان نظریات کے بانیوں نے پہلے ہی سے یہ فرض کر لیا ہے کہ خدا اور دین پر ایمان و اعتقاد کیلئے کوئی عقلی اور منطقی دلیل موجود نہیں ہے لہذا اسی وجہ سے اس سلسلے میں لغو دلائل دینے پر مجبور ہو گئے ہیں اور اس رغبت کے وجود میں آنے کی وجہ کچھ خاص نفساتی جذبات اور پھلوں کو قرار دے بیٹھے ہیں۔ مثلاً یہی کہ پہلے زمانے کا انسان طبیعی حادثات کی علت اور وجہ نہیں جانتا تھا لہذا انہیں سحر و جادو پر محمول کر دیا کرتا تھا لیکن اگر یہ واضح ہو جائے کہ دین کی طرف رغبت کے مناسب عقلی اور منطقی دلائل موجود ہیں تو ان نظریات کی اہمیت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مغربی دنیا میں دین سے فرار کے اسباب

ہم سبھی جانتے ہیں کہ بالخصوص اٹھارھویں صدی کے بعد یورپ میں عوام کا ایک بڑا طبقہ کفر اور بے دینی کی طرف مائل ہو گیا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ عام طور پر کسی دین کو اختیار کیا جائے۔ مغرب میں کفر کی طرف رغبت اور دین سے فرار کے مختلف اسباب و علل ہیں جن میں سے بعض ذیل میں بیان کئے جا رہے ہیں:

(۱) دینی تعلیمات کی توضیح و تشریح میں کلیسا کی نارسائی

مغربی دنیا میں رہبران دین اور ان میں بھی بالخصوص کلیسا کی جانب سے کی گئی دینی تعلیمات نہایت غیر معقول اور حد درجہ غیر قابل قبول تھی۔ بدیہی اور واضح ہے کہ عقل انسانی، انسان کو قطعاً اتنا آزاد نہیں چھوڑتی کہ وہ کسی بھی نظریے کو آنکھ بند کر کے بے چوں چراقبول اور اختیار کر لے۔ لہذا کسی بھی دین یا مکتب کے کامیاب اور غلبہ حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عقل سلیم کے مطابق ہو۔ مثال کے طور پر، کلیسا میں خدا کو انسان نامبنا کر پیش کیا جاتا تھا اور خدا کو انسانی شکل و صورت میں عوام کے حوالہ کیا جاتا تھا کہ خدا بدن رکھتا ہے، اس کی آنکھیں بھی ہیں اور ہاتھ پیر بھی ہیں بالکل دوسرے انسانوں کی طرح لیکن بہت بڑھا چڑھا کر اور بزرگ و قدرتمند بنا کر۔ اگر کسی کے سامنے اس کے بچپن میں اس طرح خدا کی تصویر و خاکہ پیش کیا جائے اور وہ شخص عقلی شعور و رشد یا مراتب علم تک رسائی کر کے اس بات کا یقین و علم حاصل کر لے کہ خدا اس طرح موجود نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس کے بچپن میں اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا تو ممکن ہے کہ وہ خدا کے بارے میں اپنے نظریات کی تصحیح کے بجائے خدا کے اصل وجود کا ہی انکار کر بیٹھے۔

فلیمارین اپنی کتاب GOD IN NATURE میں لکھتا ہے :

کلیسا میں خدا کی شناخت اس طرح کرائی جاتی تھی کہ اس کی داہنی اور بائیں آنکھ کے درمیان چھ ہزار فرسخ کا فاصلہ ہے۔

(۲) کلیسا کی سختیاں اور اذیت رسانیاں

کلیسا تعلیمات دینی سے متعلق اپنی مخصوص تشریح و تفسیر کو رواج دینے اور لوگوں کو ان پر تھوپنے میں ذرہ برابر پیچھے نہیں رہتا تھا اور اس سلسلہ میں ہر طرح کی زیادتی اور ظلم و تشدد روا تھا۔ یہاں تک کہ ایسے علمی موضوعات کی مخالفت پر بھی سزا ئیں دی جاتی تھیں جو براہ راست دین سے مربوط نہیں ہوتے تھے لیکن کلیسا انہیں قبول نہیں کرتا تھا مثلاً یہ کہ زمین گھوم رہی ہے۔ کلیسا کا نظریہ یہ تھا کہ زمین اپنے مدار پر بغیر حرکت کے موجود ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ قرون وسطیٰ میں کلیسا نے انکوئیزیشن (INQUISITION) یا محاکمہ تفتیش عقائد نام کے محکمے قائم کر رکھے تھے جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ ایسے لوگوں کو تلاش کریں جو کلیسا کے افکار کے مخالف ہیں اور شناخت کر کے انہیں ان کے ”جرم“ کے مطابق سزا دیں۔ WILL DURANT ان محکموں کے ذریعہ دی جانے والی سزاؤں اور سختیوں کے بارے میں رقم طراز ہے :

سزا دینے کے طریقے علاقوں اور جگہوں کے اعتبار سے مختلف تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ملزم کے دونوں ہاتھوں کو پشت سے باندھ کر اسے سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ اس کو اس قدر سختی سے باندھ دیا جاتا تھا کہ وہ اصلاً حرکت بھی نہ کر سکے اور پھر اس کے دھن میں اتنا پانی انڈیلا جاتا تھا کہ وہ شخص دم گھٹنے کی وجہ سے مرجاتا تھا یا پھر یہ کہ اس کے بازوؤں اور پنڈلیوں کو رسیوں سے اتنا کس کر باندھا جاتا تھا کہ رسی گوشت کو چھیل کر ہڈی میں پیوست ہو جاتی تھی (۷) ایک دوسری جگہ DURANT لکھتا ہے :

۱۲۸۰ء سے ۱۲۸۸ء تک یعنی ۸ سال کی مدت میں ۸۸۰۰ افراد کو جلایا اور ۹۶۲۹۲ افراد کو سخت ترین سزائیدی گئی تھیں۔ ۱۲۰۸ء سے ۱۸۰۸ء تک ۳۱۹۱۲ سے زیادہ افراد نذر آتش کئے گئے اور ۲۹۱۲۵۰ سے زیادہ افراد کو سخت ترین سزائیں دی گئیں تھیں۔ (۸)

(۳) مفاہیم فلسفی کی نارسائی

یہ ایک ایسا سبب ہے کہ جس کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ کچھ عمیق فلسفی مطالب و مباحث کا تذکرہ کیا جائے جو یہاں مناسب نہیں ہے کیونکہ ہمارے مباحث طوالت اختیار کرجائیں گے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ مغربی دنیا میں فلسفہ الہیات اور علم کلام، بہت سی ایسی طویل و عریض مشکلات کا شکار تھے کہ وجود خدا اور دوسرے تمام دینی عقائد کی عقلی، منطقی اور صحیح و حقیقی وضاحت نہیں کر پاتے تھے۔ مغرب میں فلسفی نظریات بالخصوص مسائل الہیات کس قدر کمزور اور بے بنیاد تھے، اس کی مزید وضاحت کے لئے BERTRAND RUSSELL کی مندرجہ ذیل عبارت کافی حد تک مناسب ہے۔ RUSSELL خدا کے وجود میں شک رکھتا ہے اور عملی طور پر بے دین ہے۔ وہ اپنی کتاب "WHY I AM NOT A CHRISTIAN" میں لکھتا ہے : ”اس برہان (برہان علت اولیہ) کی بنیاد اس پر منحصر ہے کہ اس کائنات میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، اس کی ایک علت ہے اور اگر علتوں کی اس زنجیر کے آخری سرے تک جایا جائے تو بالآخر علت اولیہ تک رسائی ہو جائے گی اور اس علت اولیہ کو علت العلل یا خدا کا نام دیا جاتا ہے۔“ RUSSELL آگے چل کر اس مذکورہ استدلال پر تبصرہ کرتا ہے :

”میں اپنی جوانی کے دور میں ان مسائل سے متعلق زیادہ غور و خوض نہیں کیا کرتا تھا۔ ایک مدت تک میں نے

برہان علت العلل کو قبول بھی کیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی عمر کے اٹھارھویں سال میں قدم رکھا اور اسی زمانے میں JOHN STUART کی سوانح حیات کے مطالعے کے دوران یہ جملہ میری نظر سے گزرا: ”میرے باپ نے مجھ سے کہا کہ یہ سوال کہ کس نے مجھے خلق کیا ہے؟ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ فوراً ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ پھر ”خدا کو کس نے خلق کیا ہے؟“۔ اس جملے نے بڑی آسانی سے برہان علت العلل کو میری نظر میں باطل کر دیا اور میری نگاہ میں یہ برہان ابھی تک بے بنیاد ہے۔ اگر ہر شے علت کی محتاج ہے تو لامحالہ خدا کو بھی ایک علت کا محتاج ہونا چاہئے اور یہیں سے یہ برہان باطل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص فلسفہ اسلامی سے ذرہ برابر بھی آشنائی رکھتا ہو تو اس کو پہلے ہی مرحلے میں RUSSELL کے مذکورہ دعوے کی خامیاں نظر آجائیں گی۔ RUSSELL کے اعتبار سے قانون علیت یہ ہے کہ ”ہر موجود، محتاج علت ہے۔“ جب کہ حقیقی قانون علیت یہ ہے کہ ”ہر ممکن، محتاج علت ہے۔“ لہذا اس کائنات کی علت اولیہ، ازل سے خوبخود اس قاعدے سے باہر ہے۔ مثلاً، جس طرح قاعدہ ”ہر فاسق، جھوٹا ہوتا ہے“ روز اول سے انسان عادل کے دائرے سے باہر ہے۔ پیش نظر مباحث، بعض دوسرے مباحث فلسفی کے محتاج ہیں جن کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

(۴) مفاہیم اجتماعی کی نارسائی

مغرب میں یہ نظریہ رواج پا چکا ہے کہ معاشرے پر دینی حکومت کا نتیجہ پوری طرح آزادی کا خاتمہ، ڈکٹیٹر شپ اور ایسے لوگوں کی جبر آمیز حکومت ہے جو خدا کی طرف سے خود کو لوگوں پر حاکم گردانتے ہیں۔ عوام یہ سوچتے تھے کہ اگر خدا کو قبول کر لیا تو لازمی طور پر قدرت ہائے مطلقہ کی ڈکٹیٹر شپ کو بھی لامحالہ قبول کرنا پڑے گا اس طرح کہ کوئی بھی شخص آزاد نہیں ہوگا۔ لہذا خدا کو قبول کرنا اجتماعی قید و بند کے مترادف ہے۔ پس اگر اجتماعی آزادی کی خواہش ہے تو خدا کا انکار کرنا ہوگا۔ بہر حال اجتماعی آزادی کو ترجیح دی گئی اور خدا کا انکار کر دیا گیا۔ اسلام جو کہ زمانہ حاضر میں واحد ایسا دین ہے جو کسی بھی طرح کی تبدیلی و تغیر اور تحریف سے محفوظ ہے، نے رہبران دین کیلئے اس نکتہ پر نہایت تاکید کی ہے کہ اگر وہ عوام پر حق رکھتے ہیں تو عوام بھی ان پر حق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت علی ریال کے خطبے کا مندرجہ اقتباس قابل غور ہے: --- ”پروردگار نے ولی امر ہونے کی بنا پر تم پر میرا ایک حق قرار دیا ہے اور تمہارا بھی میرے اوپر ایک طرح کا ایک حق ہے۔۔۔ حق ہمیشہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ یہ کسی کا اس وقت تک ساتھ نہیں دیتا ہے جب تک اس کے ذمے کوئی حق ثابت نہ کر دے اور کسی کے خلاف فیصلہ نہیں کرتا ہے جب تک اسے کوئی حق نہ دلوادے۔ اگر کوئی ہستی ایسی ممکن ہے جس کا دوسروں پر حق ہو اور اس پر کسی کا حق نہ ہو تو وہ صرف پروردگار کی ہستی ہے کہ وہ ہر شے پر قادر ہے اور اس کے تمام فیصلے عدل و انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔“ (۹)

(۵) مسائل الہیات سے متعلق سرسری اظہار نظر

اسقدر خدا شناسی بالکل سادہ اور فطری ہے جتنی کہ عوام الناس کا وظیفہ اور ذمہ داری ہے کہ سمجھیں اور

اس پر ایمان لائیں لیکن مسائل فلسفی کے ادق اور عمیق مباحث نہایت پیچیدہ اور گنجلیک ہیں اور اس قدر پیچیدہ اور گنجلیک ہیں کہ ہر شخص اس وادی میں داخل بھی نہیں ہوسکتا۔ مباحث صفات و اسمائے الہی، قضا و قدر الہی، جبر و اختیار وغیرہ اسی طرح کے دشوارترین مسائل ہیں اور بقول حضرت علی علیہ السلام ”دریائے عمیق“ ہیں لیکن نہایت افسوس ناک بات ہے کہ مغرب میں بھی اور مشرق میں بھی ہر کس و ناکس اپنے اندر اتنی جرأت پیدا کرلیتا ہے کہ ان دشوارترین مباحث پر اپنے نظریات پیش کردے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مذکورہ مسائل و مباحث غلط اور غیر صحیح طور پر عوام تک منتقل ہوجاتے ہیں اور عوام حقانیت دین سے متعلق تردد و شک کا شکار ہوجاتے ہیں۔ شہید مرتضیٰ مطہری اس سلسلے میں ایک داستان نقل فرماتے ہیں:

خدا نے اونٹ کو پرکیوں نہیں دئے جب کہ کبوتر کو دئیے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ایک شخص نے کہا: اگر کبوتر کی طرح اونٹ کے بھی پرہوتے تو ہماری زندگی تلخ ہو گئی ہوتی۔ اونٹ پر واز کرتا اور ہمارے لکڑی اور مٹی سے بنے مکانوں کو تباہ کردیتا۔ ایک دوسرے شخص سے سوال کیا گیا کہ خدا کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ اس نے کہا: تل ہی سے تاڑ بنتا ہے۔ (۱۰) دلیل کا کمزور ہونا ہرگز دعوے کے باطل ہونے کا سبب نہیں بن سکتا لیکن نفسیاتی طور پر جب بھی کسی دعوے کے لئے کوئی کمزور دلیل پیش کی جاتی ہے توسننے والا دعوے کے صحیح ہونے کے بارے میں ہی تردید کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو ایک قدم آگے بڑھ کر اس کو اس دعوے کے باطل ہونے کا یقین بھی ہوجاتا ہے۔ نادان افراد کی جانب سے عقائد اور دینی تعلیمات کی غلط اور غیر صحیح تفسیر و تشریح بھی بسا اوقات بے دینی کی طرف تمائل کا سبب بن جاتی ہے۔

(۶) دین کو دنیاوی سعادت میں حائل بنا کر پیش کرنا

انسان کچھ ایسے جذبات اور غریزوں کا مالک ہے جنہیں حکمت الہی نے اس کے اندر ودیعت کیا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو سروسامان عطا کرسکے اور اس ہدف تک پہنچ سکے جس کے پیش نظر اس کو خلق کیا گیا ہے۔ تمایل جنسی، فرزند طلبی، علم و معرفت سے محبت اور خوبصورتی کی چاہت مذکورہ جذبات و غرائز کی کچھ مثالیں ہیں۔ اگرچہ انسان کو ان جذبات و غرائز کا تابع محض نہیں ہونا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ انہیں چھوڑ دے یا مکمل طور پر ان کی مخالفت کریٹھے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ جذبات و غرائز میں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ اب اگر دین اور خدا کے نام پر ان غرائز کی مکمل طور پر نفی اور مخالفت کردی جائے اور مثلاً تجرد و رهبانیت کو مقدس اور شادی کو پست سمجھ لیا جائے نیز دولت و قدرت کوتباہی، بربادی و بدبختی کی علت اور فقر و کمزوری کو خوش بختی کی علامت تسلیم کرلیا جائے تو فطری طور پر یہی ہوگا کہ انسان دین سے کنارہ کش اور خدا کا منکر ہوجائے گا کیونکہ یہ تمام خواہشات و غرائز انسانی طبیعت میں دخیل ہیں اور انسان ان سے حد درجہ متاثر ہوتا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ جو مرض کبھی مغربی دنیا میں پھیل گیا تھا اور آج تک اس کا اثر باقی ہے اس کو بعض نیم حکیم قسم کے افراد بسا اوقات مسلمانوں کے درمیان بھی رائج کرنا چاہتے ہیں۔ BERTRAND RUSSELL کہتا ہے: ”کلیسا کے تعلیمات، بشر کو دو طرح کی بدبختیوں اور محرومیوں میں قرار دیتے ہیں: یا دنیا کی نعمتوں سے محرومی یا آخرت کی نعمتوں اور لذائز سے کنارہ کشی۔ کلیسا کے مطابق انسان کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں محرومیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ یا دنیا میں ذلیل و خوار ہو اور اس کے بدلے میں آخرت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو یا

اس کے برعکس اگر دنیا میں عیش و عشرت چاہتا ہے تو آخرت میں پریشانیاں اور سختیاں برداشت کرے۔“ (۱۱) لیکن کلیسا کا یہ نظریہ بالکل بے بنیاد اور باطل ہے۔ حقیقی دین دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے اور اگر کوئی شخص دین سے فرار اختیار کرتا ہے تو آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگا۔ کسی بھی عاقل انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیوں خدا نے بشر کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں سے کسی ایک کو قبول کرے؟ کیا خدا بخیل ہے؟! حقیقت یہ ہے کہ دینی تکالیف و وظائف کی انجام دہی آخرت کے ساتھ دنیاوی زندگی کو بھی باعزت اور باسعادت بناتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم ایک بار پھر علامہ شہید مرتضیٰ مطہری کی طرف رجوع کرتے ہیں:

”بعض مبلغین کی خلاف حقیقت، تعلیم اور تبلیغ اس بات کی موجب ہوتی ہے کہ بشر دین سے متنفر ہو جائے اور یہ فرض کر لے کہ خداشناسی محرومیت، ذلت و خواری اور اس دنیا میں مشکلات و پریشانیوں کا لازمہ ہے۔“ (۱۲)

(۷) فساد اخلاقی و عملی

دین کی قبولیت انسانی زندگی میں بعض شرائط و قیود کی موجب ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ایسے لوگ جو شہوت پرستی اور ہوا و ہوس میں غرق ہوتے ہیں، دین کو اپنی آزادی میں مغل گردانتے ہیں لہذا دین کا انکار کر کے خود کو آزاد سمجھ لیتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

جو لوگ قیامت کے واقع ہونے میں تردید کے شکار ہیں درحقیقت ان کا یہ شک کوئی علمی شک نہیں بلکہ اپنی شہوت پرستی اور بے راہ روی کی بنیاد پر قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ (بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجَرًا أَمَامَهُ) اور قیامت کے حساب و کتاب سے بے پرواہ ہو کر ساری عمر گناہ کرتے ہیں۔ (۱۳) دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ فساد اخلاقی و عملی، حق و حقیقت کو قبول کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ توحید ایک ایسا تخم ہے جو صرف پاک و پاکیزہ زمین ہی میں رشد پاسکتا ہے۔ بنجر اور ریتیلی زمین اس بیج کو تباہ و برباد کردیتی ہے۔ اگر انسان اپنے عمل میں شہوت پرست و مادہ پرست ہو جائے تو آہستہ آہستہ اس کے افکار و خیالات بھی قاعدہ ”اصل انطباق با جامعہ“ کے تحت اس روحی اور اخلاقی فضا کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے خدا نے قرآن مجید کی ہدایت کو فقط متقین کے لئے قرار دیا ہے (ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ) یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے یہ صاحبان تقویٰ اور پرہیزگار لوگوں کیلئے مجسم ہدایت ہے (۱۴) اور اس کے انذار و عذاب کو ان لوگوں سے مخصوص کر دیا ہے جو شہوت پرستی و فساد اخلاقی اور جنسی میں غرق ہوتے ہیں۔ (إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ لِّنَذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقُّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ) یہ تو ایک نصیحت اور کھلا ہوا روشن قرآن ہے تاکہ اس کے ذریعہ زندہ افراد کو عذاب الہی سے ڈرائیں اور کفار پر حجت تمام ہو جائے (۱۵) گزشتہ دو تین صدیوں میں مغربی دنیا میں مفسد اخلاقی و اجتماعی کی شدت و زیادتی نے لوگوں کو اخلاقیات و معنویات کی فضا سے دور کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اعتقادی نقطہ نظر سے بھی لوگ معارف و تعلیمات دینی سے برگشتہ ہو گئے ہیں۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ أَصَاوُوا الشُّوَاٰ اِنَّ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ اور اس کے بعد برائی کرنے والوں کا انجام برا ہوا کہ انہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلادیا۔ (۱۶) یہی وہ حربہ تھا جس کی وجہ سے مغربی دنیا کے عیسائیوں نے اسپین کی ناقابل تسخیر حکومت کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ انہوں نے وہاں مسلمانوں کو عیش و عشرت، شہوت پرستی، جام و شراب میں غرق کر دیا اور پھر بڑی آسانی

سے مسلمانوں کو اس سرزمین سے باہر نکال دیا۔

حوالہ جات:

- ۱۔ فاتحہ/۴: مالک يوم الدين ، نیز صافات/۵۳، واقعہ / ۸۷، حجر/۳۵، ذاریات ۲۔ توبہ /۳۳: هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق
- ۳۔ یونس / ۲۲: دعوا الله مخلصین له الدین
- ۴۔ فصلت/۴۲
- ۵۔ مثلاً حشر/۳۱، فصلت/ ۱۱، لیکن توجہ رکھنی چاہئے کہ کسی بھی آیت کو تمثیل پر حمل کرنا فقط اسی صورت میں جایز ہے جب قرائن و شواہد تمثیل پر دلالت کرتے ہوں ۔ ۶۔ سبا ۲۷
- ۷۔ ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن ، ج ۱۸، ص ۳۵۰
- ۸۔ ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن ، ج ۱۸، ص ۳۶۰
- ۹۔ نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۲۱۶
- ۱۰۔ شہید مرتضیٰ مطہری، علل گرایش بہ مادی گری ، ص ۱۰۸
- ۱۱۔ منقول از شہید مرتضیٰ مطہری، علل گرایش بہ مادی گری ، ص ۱۲
- ۱۲۔ وہی مدرک صفحہ / ۱۱۳
- ۱۳۔ قیامت/۵
- ۱۴۔ بقرہ: ۲
- ۱۵۔ یس: ۶۹-۷۰
- ۱۶۔ روم: ۱۰